قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک کتاب ایسی موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اسکے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریقِ حصول کے متعلق "قوم پرست" جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہر لال کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جسکی گہرائیوں تک ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے اُن نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کرلیا ہے اور پھر اپنی پر اُس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کرونگا، تاکہ اس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتدا یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض

کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے انکے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اسکو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ فرانس ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے۔ اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدہ کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے، ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے، اور اس اشتراک ہی نے انکے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس، رشتہ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں :۔

> "ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔ . . . . . مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لیے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پا سکے۔" (میری کہانی - جلد دوم - صفحہ ۱۳۱ - ۲۳۲ مکتبۂ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے

ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے، اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ——— آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھیے، مگر ہے یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظرانداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصور قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں، اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اُس کے نزدیک، جواہر لال نہرو کے الفاظ میں:

> "دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی مفاد ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (ص ۴۵۷)

اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں

ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے، اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا۔" (ص ۱۴۱)

اپنے تصور قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اول تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیاد ہی پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جنکے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں، اور جنکے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، وھلم جرّا۔ پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو اسی چیز پر لڑنا چاہیے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے:۔

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔" ص ۳۳۱

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس وقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد اقتصادی فوائد پر رکھی جاتی ہے۔" (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو

مسلم اور دوسرے فرقے پیدا کیسے ہو گئے ؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ سے اختلافات پیدا کر دیے ؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور اذعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے انکے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے، صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اسکی ذہنیت اور اسکے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے ـــــ عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے ـــــ قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفریق ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل انداز ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد) کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرز خیال اور طریق زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں :-

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے یکسر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانیکا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے" (صفحہ ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کیساتھ

کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طول عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو"؟ اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور انکے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کیلیے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی، اسی لیے اور صرف اسی لیے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھیے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کیلیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنا لیا ہے، نہ اس لیے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لیے کہ ان اختلافات کو دائماً برقرار رکھ کر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے رہیں۔ دوسرے وہ بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کیساتھ حل کرنے سے انکار کرتے

ہیں، اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس نظر سے اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں صحیح راستہ صاف نظر آجاتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھ کر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کیساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے، بلکہ یہ صرف برطانوی امپیریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:۔

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا" (ص ۲۰)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے" (ص ۲۳)

"اغراض کے اس ہجوم میں .... برطانوی ہند کے نمایندوں کی سرداری عموماً آغا خاں کے حصہ میں آئی تھی" (ص ۲۱)

"اصل دقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی راہ میں حائل تھی اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی" (ص ۲۴)

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اسکی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آجکل برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں" (ص ۱۷۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لیے نہیں ہے۔" (ص ۳۱۱)

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ انکا انداز فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے، اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنیکی زحمت کون اٹھائے؟ اسکا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے "ہندوستانی قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کیلیے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار، زمیندار، اور تمام مستقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کیساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کیلیے استعمال کر رہے ہیں، لہذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے، تینوں باہم قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابلِ نفرت ہیں، اور تینوں کو مٹا دینا چاہیے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:-

"منظّم مذہب (Organised Religion) بلا استثنا مستقل اغراض سے وابستہ ہوجاتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے ......
حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اسکا رویہ یہی ہے" (ص ۱۶۷-۲۶)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں - مذہبی کتابیں اور ناول - یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کیساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے" (ص ۱۱۵)

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اسکے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے جس کا دارومدار ظلم پر ہے" (ص ۳۹۴)

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے :-

"ہر پھر کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جسکے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں - یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام، پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں - ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے - یہ انقلاب کس طریقہ سے ہونا چاہیے ؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے - لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس چیز میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں رد کی جاسکتی کہ کچھ لوگ جو موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیّر کے مخالف ہیں - اگر سیاسی یا تمدنی اوارے[1] اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے" (ص ۲۰-۲۱۹)

"جب تک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لیے قوم پرستی کا

---

[1] مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا، مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں -

تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہیگا . . . . . یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تمدنی و اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ پیدا ہو جائے[1]" (ص ۱۴۵)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لیے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے . . . . . یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انھیں بھی راضی کر لینا چاہیے . . . . . یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقائد بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے، یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائیگی، اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنے جبر و تشدد سے کام لیے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھائے گی، یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائیگا[2]" (ص ۵۸-۵۶)

[1] یہ مقام ذرا سی تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے۔ اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے، جسکی تشریح بابو سوباش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کی ہے۔ جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہو جائے، کسی ایک ملک میں اسکا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور انکے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سردست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو۔ سب سے پہلے اپنے ملک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کیلیے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔

[2] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے۔ پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں انکو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے[1]" (ص ۴۵۵)

"سوسائیٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور پھر طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں - اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانہ پر کرنا پڑیگا - کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی - لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی" (ص ۴۶۹-۷۰)

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کیلیے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے - قومی حکومت (یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے) آخری منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے - دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کر کے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے - اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر، دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کر کے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کر کے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے - پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا - ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائیگا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہوگی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام -

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ

[1] ڈیماکریسی (جمہوریت) کے اس تصور کو خوب (ص ۵۴) سمجھ لیجیے -

ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہذا ہندوؤں کی نسبت وہ اس اشتراکی انقلاب کیلیے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکینگے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں۔ لہذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے :-

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسلیے کہ انکے نظام اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائینگے۔ (صفحہ ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جسکی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کیلیے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب کیساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے، کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اسکو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے۔ اسکے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے جسکی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں۔ ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشۂ جنگ بنایا ہے۔

اُن کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں، اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف "ہندوستانی قوم" ہی پائی جاتی ہے، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے:-

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے، اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابلِ توجہ کہا جا سکتا ہے۔[1]" (ص ۳۳۱)

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اسکا خاتمہ ہو جاتا۔" (ص ۳۳۲)

[1] جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اسکے باوجود اسلامی قومیت کے خلاف یہ طرزِ استدلال اختیار کر رہے ہیں، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کے خلاف محض سیاسی چال کے طور پر یہ طرزِ استدلال اختیار فرمایا ہے۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ "تمام دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ۔" اسکی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کے اشتراکی کا کامریڈ (رفیق) ہے اور خود اپنے وطن بلکہ شہر، بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اسکا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال بھی اس تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں، مگر اسکے باوجود وہ اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے :-

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا یہ عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں کی ایک یاد ہے جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آج کل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا کبھی ذکر کرتا ہو۔"[1] (ص ۳۳۳)

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان،

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۶ - قائم ہوئی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصد زندگی اور ایک اصول اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں، ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو اور اسکے خلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم محلہ کیا معنی، ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے۔ ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لا محالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے اسلیے وہ قصداً ٹھیک اُسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں، اور اعتراض کیلیے ان دلائل سے کام لے رہے ہیں جنکی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے!

[1] تہذیب کے متعلق اسی قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبۂ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے :

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اسکا جلوہ شاعری، فنِ تعمیر، سنگتراشی، مصوری اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جنکا مجسمہ تہذیب

اور انہی کی طرح ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں: ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کیلیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی دراصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے تعلیم یافتہ مسلمان شاذ ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علیگڈھ والے البتہ سرخ ترکی ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) ۔ مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں[1]" (صہ ۳۳۵)

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۔ ہے۔ کیا ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بین فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لے لیجیے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو آج ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گانے ہیں؟ کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گانے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فنِ تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو تہذیب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں؟" ("مدینہ" مورخہ ۲۱ اپریل ۳۸ء)

"ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے؟" (حوالہ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ سیاسی فریبکاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ

سلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفسِ تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے (۵۸) اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرات کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول صفحہ ۴۸ تا

[1] حاشیہ صفحہ ۵۵ ملاحظہ ہو

یہاں تک تو صرف یہ وعظ تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے۔ اسکے بعد دوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دینگے، اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں :-

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بہت تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت بنتی جا رہی ہے ..... اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا" (صفحہ ۳۳۲)۔

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور انکے بہت سے خیالات جنکی پرورش بڑی تمناؤں سے کی گئی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی، ترک نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جسکے لیے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور ہی لیے جا رہے ہیں... مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے... یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے۔ ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کیلیے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جا رہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے" (صفحہ ۳۳۶)

حاشیہ صفحہ ۵۔ یہاں مسلمانوں کے درمیان قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے، اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لیے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لیکر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اس امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں اور ہمیں اب اس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیش نظر ہے۔

۱۵ اسلام کو برسر انحطاط، بلکہ بزعم خود فنا پذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجیے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کیلیے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لیے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت مذہب پرست مسلمان، اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانینگے۔ لہذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اسکی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر بڑا زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ضروری ہے تاکہ دونوں میں توازن قائم رکھے اور بیچ بچاؤ کر سکے (صفحہ ۳۳)

"(مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا) مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے یا بدیسی حکومت" (صفحہ ۳۳)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟" (صفحہ ۳۳)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی لیڈر" نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور اُن کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے

تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو، ورنہ جو کوئی یہ نام لے گا، ٹوڈی قرار دیا جائیگا ـــــ یہ آخری ضرب بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے اُن لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈیت کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظام اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں تاکہ اس کو درہم برہم کر کے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کر لیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں، جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کیلیے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں، اور ان کو ایک لمحہ کیلیے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اُس تہذیب کو خیرباد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا، یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا، اور اس غرض کیلیے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہیگا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کر کے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہِ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے

اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لیے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اسکے کہ مسلمانوں کا "بورژوا" طبقہ ــــ اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے ــــ بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لی جائے۔

یہی حقیقت ہے اُس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے" (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:۔

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر دتوں فرقہ دارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے۔ یہ طریقہ نکما ہے اور میں چاہتا ہوں کہ ہم دوبارہ ادہر نگاہ بھی نہ ڈالیں۔ ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھ کر سب مل کر قومی آزادی کیلیے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑیگا۔ جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ دارانہ مسئلہ بن گیا ہے اسکا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم، کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو

تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں۔ ان کو سامنے رکھکر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آجائیگا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شُدھی نہیں، سیاسی اور معاشی شُدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شُدھی کا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے۔ اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علماء تک اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اُس تحریک کے بانیوں نے پھوہڑپن سے کام لیا تھا۔ اُنہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آجاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو، تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے، لہذا کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی "ہندوستانی قوم" کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اس انٹرا کی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ——— ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھیے، کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیرِ مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔